Fikr-o-Nasar (Islamabad) 46:1,2 (2008)

فکر و نظر............ اسلام آباد   جلد: ۴۶   شمارہ: ۲،۱

اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر☆

۱۷۰۷ء-۱۸۵۷ء

اُردو ادب کی ایک اہم دستاویز

جمیل نقوی

اُردو ادب کی تاریخ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک قدیم جو برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر ۱۸۵۷ء میں دولتِ مغلیہ کے اختتام تک محیط ہے۔ اور دوسرا جدید، جس کا آغاز انگریزوں کے قیامِ سلطنت سے ہوا اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ قدیم دور مسلمانوں کے مسلسل عروج و اقتدار کا دور ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال پر مشتمل ہے۔ اس میں تاریخی، تہذیبی، تمدنی، لسانی، مذہبی اور علمی و ادبی ہر اعتبار سے جو بھی تغیرات رونما ہوئے، وہ مسلمانوں ہی کی آمد کا نتیجہ تھے۔

جدید آریائی زبانیں انہی کے وسیع و ہر جہتی اثرات کی پیداوارتھیں جن میں سے اُردو نے رفتہ رفتہ برصغیر کی عموی زبان (لنگو افرینکا) کی حیثیت اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ گوناں گوں مقامی اور دیگر اثرات کے باعث اس زبان نے کتنے ہی رنگ بدلے اور کتنی ہی صورتیں اختیار کیں اور انہی کے ساتھ اس کا ادب بھی وقتاً فوقتاً حالات و ظروف کے مطابق نئے نئے روپ اختیار کرتا رہا۔ اتنے طویل عرصے، اتنے وسیع علاقے پر مسلسل پخت و پز کے زیرِ اثر کتنے ہی مظاہر پیدا کیے، جو بے حد دلچسپ بھی ہیں اور پیچیدہ بھی۔ صرف زبانوں ہی کو لیا جائے تو وہ ایسے اَدق مسائل پیدا کرتے ہیں جن کی چھان بین بہت دشوار ہے۔ سارے کا سارا دور قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حادثات، واقعات پر گہری دھند چھائی ہوئی ہے جس کے پردوں کو چیر کر حقائق تک رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے:

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

ان حقائق کا سراغ لگانا آثارِ قدیمہ کی کھوج لگانے سے کچھ کم نہیں۔ اس لیے ہمیں زندگی کے ہر پہلو، سیاسی، عمرانی، ثقافتی، معاشی، لسانی اور علمی و ادبی کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبان و ادب

☆ ماخوذ از ڈاکٹر ابوالخیر کشفیؒ، سال اشاعت، اگست ۱۹۷۵ء، صفحات ۴۳۶، ناشر: ادبی پبلشرز، اے-ایم ۲، شاہراہ لیاقت، کراچی

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

کی گتھیوں کو سلجھانا ہونا ہو گا۔ ایک بے حد کٹھن مہم جس کے لیے ہمہ گیر تلاش و تفحص، ہر جہتی کد و کاوش اور غیرمعمولی صلاحیتوں کے ساتھ نگاہِ ہمہ بیں کی بھی ضرورت ہے۔ اتنے اسباب و لوازمات فراہم ہوں تب کہیں ان سربستہ رموز کی گرہ کشائی ممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب تک جستہ جستہ کوششوں ہی سے متفرق حقائق اُجاگر کیے جا سکتے ہیں اور زبان و ادب کا سرسری جائزہ پیش کیا جا سکا ہے۔ زیادہ تر تاریخ کی شکل میں جس کی حیثیت مختلف ادوار کے تعین اور روداد کی ہے۔ مصنفین خصوصاً شعراء کے سوانحی حالات، ان کے کلام کی خصوصیات اور ان پر نقد و نظر، دورِ قدیم میں تذکروں ہی کا رواج رہا جو سوانحی حالات اور پرانی وضع کی رواجی تنقید ہی کا آمیزہ ہیں۔ ان سے جہاں کوائف پر روشنی پڑتی ہے وہاں کتنے ہی اہم گوشوں پر تاریکی چھائی رہتی ہے اور ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

جدید دور میں کچھ تذکرہ نما تصانیف (آبِ حیات، شعرالہند، گلِ رعنا وغیرہ) کے علاوہ نئے انداز میں سوانحی و تنقیدی پیشکشیں بھی سامنے آئی ہیں لیکن زندگی کے جملہ کوائف اور پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے بیک وقت نتیجہ خیز تحقیق اور بصیرت افروز تنقید کا حق ادا نہیں کیا جا سکا۔ جن سے ہم حالات و واقعات کو صحیح تناظر میں دیکھ سکیں۔ یہ مہم صرف معروضی مطالعہ ہی سے سر کی جا سکتی ہے جس میں داخلی امیال و عواطف سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔ بے حد صبر آزما، بے حد کارآمد، جس میں ہر قدم ''کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق'' کی صدا گوش زد ہوتی ہے۔ اگر یہ کوشش پوری جامعیت اور تفحص سے نہ بھی ہو سکے تو بھی بقدرِ قلیل مفید اور اہم ہے۔ کیوں کہ اس سے اُردو زبان و ادب کے وہ گوشے جو ہنوز دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں، اُبھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور ہم ان پر زیادہ صحت مندی اور وثوق سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ یہ کام درحقیقت راجہ جنگ کی کمان کو زہ کرنے سے کم نہیں۔ اگر کوئی اپنے زورِ بازو سے زہ کر سکے۔

شاید ایک عرصہ تک یہی صورتِ حال رہتی لیکن ڈاکٹر ابوالخیر کشفی جیسے جواں ہمت ......نوجوان مگر مثلِ پیراں پختہ کار...... نے یہ کٹھن مہم اپنے سر لی اور اسے غیرمعمولی کاوش اور سالہا سال کی محنت و جانفشانی سے انجام دیا۔ خوش قسمتی سے قدرت نے انہیں وہ صلاحیتیں اور علمی فضائل عطا کیے ہیں جن سے اس دشوار کام کا اعلیٰ طور پر انجام پانا ممکن ہوا۔ علمی اعتبار سے دیکھا جائے تو بڑی حد تک ڈاکٹر کشفی کا شمار **رَاسِخُونَ فِی العِلْمِ** میں ہوتا ہے۔(۱)

بایں ہمہ ''ہنر ذات'' ان کے بوقلمونی علمی، تحقیقی و تدریسی فضائل پر فوقیت رکھتا ہے کیوں کہ علم

و ادب کا یہی ذوق، تحقیق سے لگاؤ، فطری بصیرت، جبلی تنقیدی شعور، مبادیاتِ ادب و فن پر محرمانہ گرفت اور گیسوئے اُردو کی شانہ آرائی کا والہانہ شغف، خدا داد صلاحیتوں کو صحیح منہج پر گامزن ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ اس کا انداز اُن کی زیرِنظر محققانہ تصنیف ''اُردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک'' سے کیا جا سکتا ہے۔ جو میں سمجھتا ہوں ان کی بہترین تصنیف ہے۔

ڈاکٹر کشفی نے پی ایچ ڈی کے لیے اس عنوان کا انتخاب کرنے میں بڑی فہم و فراست اور حوصلہ کا ثبوت دیا ہے کیوں کہ اُردو کا لسانی و ادبی پس منظر زیادہ تر اسی ڈیڑھ صدی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی پیداوار اور نشوونما اسی دور میں ہوئی۔ اس دور کو اجالے بغیر تمام اُردو زبان و ادب، اُن کی اساس، ظہور، نشوونما اور خصوصیات کو...... کماحقہٗ سمجھنا اور صحیح رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ گویا اس کتاب کی اہمیت، اُردو زبان و ادب کے ایک بنیادی مقدمہ کی ہے جس سے ہم روایتی آراء اور توضیحات کی تصحیح بھی کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں تحقیق و تنقید کا قدم بھی آگے بڑھا سکتے ہیں اور اس طرح یہ اہم لسانی و ادبی دستاویز ''چراغِ راہ'' کا کام بھی دیتی ہے۔

تحقیق ایسا میدان ہے جس میں ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے۔ اس لیے محقق کو بے حد احتیاط، فہم و فراست اور معتدل مزاجی سے کام لینا پڑتا ہے۔ سب سے بڑا اندیشہ خود اپنی ذات سے ہوتا ہے کیوں کہ اکثر ہم اپنے ہی رجحانات کے چنگل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ اپنی نفی اور موضوع پر معروضی حیثیت سے ارتکاز۔ صرف اسی طرح صحیح نتائج کا استنباط ممکن ہے۔

کشفی صاحب نے بڑی دیدہ وری سے پہلے ہی یہ حقیقت محسوس کر کے اس کی نشان دہی کر دی ہے کہ:

> ''......سیاسی پس منظر کے بیان میں، میں نے ممکنہ معروضیت اور غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے میری ناچیز رائے میں مکمل غیر جانبداری نفسیاتی طور پر ممکن نہیں......''

اس سے بڑی حد تک تحقیق میں سلاست وری کی ضمانت ہو جاتی ہے اور محقق صحیح راہ سے بھٹکنے نہیں پاتا۔

کتاب میں جس انداز سے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور عمرانی ادوار کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے مصنف کے معروضی روش اختیار کرنے کی تصدیق ہوتی ہے۔ شاید ہی کوئی نتیجہ اخذ کیا گیا ہو جس سے دلائل و شواہد کی بناء پر اختلاف کیا جا سکے۔ اس طرح ہم اپنے تعصّبات اور راسخ شدہ تأثرات کو بھول

کر زیرِبحث دور میں اُردو زبان و ادب کے مظاہر کو تحقیقی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔

فی زمانہ کسی بھی شعبہ علم و ادب میں پیش رفت کے لیے انگریزی، فارسی و عربی زبانوں پر عبور اشد ضروری ہے اور علوم سلف کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ میں وسیع دلچسپی، جس سے کوائف و حقائق تک رسائی میں مدد ملتی ہے۔ خصوصاً تاریخ جس میں عہد رفتہ کی ساری داستان منضبط ہوتی ہے۔

کشفی صاحب کی ان السنہ اور علمی مآخذ پر خصوصی دسترس، نیز کتب حوالہ و استفادہ کی بہم آوری، انہیں حصولِ معلومات اور اخذِ نتائج میں بے حد مدد دیتی ہے۔ جیسے وہ بیک وقت دُوربینی اور خورد بینی آلات سے مسلح ہو کر وسیع سے وسیع اور باریک سے باریک، جلی و خفی حقائق کا سراغ لگا رہے ہیں اور دریافتوں کے بین السطور انکشافات کا مبہوت کن انبار لگا دیتے ہیں۔

انعکاسِ نور ادبیات کو اجالنے، ابھارنے اور اپنی پوری معنویت کے ساتھ اُجاگر کرنے میں بے حد مدد دیتا ہے اور ان آراء، بیانات اور قیاسات کی تصحیح کرتا ہے جو روا روی میں یا عدم واقفیت کی بناء پر ظاہر کر دیے جاتے ہیں اور تصویر کو غلط زاویہ سے دیکھنے کا باعث ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں تحقیق کے دوران ایک بڑی بات حالات و واقعات کا ایسا نادیدہ رُخ دیکھنا ہوتا ہے جو بالعموم نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ براؤننگ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اس طرح کے کرداروں کا کروٹ بدل کر رُخ بھانپنے میں طاق تھا۔ جیسے کسی نے اس کے سامنے نہایت خوبصورت گڑیا لا کر رکھ دی ہو اور وہ اس کے اندر بھرے ہوئے برادے کو اُلٹ کر باہر گرا دے۔ وہی بات

''جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ سکتی ہے''

زیرنظر کتاب میں ایسے شواہد و حقائق بے شمار نظر آئیں گے جو استنباطِ نتائج کے ساتھ مل کر اسے حوالہ کی معتبر کتاب بنا دیتے ہیں اور شگفتہ، شستہ و رفتہ اسلوب بیان اس کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری ادبیات میں ایک اعلیٰ درجہ کی معیاری، ذوق افروز دستاویز کا اضافہ ہو گیا ہے جس کی مستقل تاریخی حیثیت ہے۔(۲)

کسی محققانہ تصنیف کی وسیع ترین خصوصیت کوائف و شواہد کا احاطہ ہے۔ دیدہ ورانہ محاکمہ اور ایسے نتائج کا استنباط ہوتا ہے جو اپنی معقولیت کی خود گواہی دیں۔ کشفی صاحب نے جو لائحہ عمل اختیار کیا ہے اور اس کی ''حرفِ آغاز'' میں نکتہ بہ نکتہ نشان دہی کی ہے۔ مثلاً تعمیم، قیاسات، علمی اخلاق، معروضیت، داخلیت سے حتی الوسع اجتناب، دیانت وغیرہ۔ اس سے تحقیق میں وثوق و قطعیت کی راہ ہموار ہو جاتی ہے اور محقق خود بخود ایک تنی ہوئی رسی کے پل پر چلتا ہے جس میں ادھر ادھر سرکنے

کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں اور توازن برقرار رکھتے ہوئے صحیح مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

اس طرح کشفی صاحب نے تحقیق کے ساتھ ساتھ اخلاقیاتِ تحقیق بھی مدوّن کر دیے ہیں جو آئندہ تحقیق کے لیے ایک شیوۂ مستحسن مقرر کر دیں گے۔ گویا ایک دستور، ایک ضابطہ مقرر ہو جائے گا جس میں پرانی طرح کے شیشہ گروں پر کلوخ اندازی اور تسامحات پر تعریض و طعنہ زنی کا سدِّ باب ہو جائے گا اور ہم صحت مند خطوط پر گامزن ہو سکیں گے۔ اربابِ علم کو کشفی صاحب کے اس فیضان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے اور اس کے پاؤں بقدر وسعت پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ اس لیے محقق کو ہر چہ گیرد مختصر گیرد کے زرین مشورہ ہی پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ کشفی صاحب نے حتی الوسع دستیاب مآخذ پر اکتفاء کرتے ہوئے خاصی حد تک جامع مرقع پیش کیا ہے جس سے زیرِنظر دور کا ابھرواں نقشہ یا ''کلوز اپ'' اپنے مخصوص خد و خال کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ اور ہم اسے پوری طرح پہچان سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مزید کوائف بہم پہنچنے پر یہ مرقع اور بھی جامع اور منور ہو سکتا ہے۔

مثلاً جہاں فاضل محقق نے سلف کے گھناؤنے اخلاقی پہلو کا ذکر کیا ہے، وہاں اس کی زیریں پاتالی سطح ان حقائق کے ساتھ اور بھی اُجاگر کی جا سکتی تھی جس کی تفصیل رونگٹے کھڑے کرنے والی رُوداد ایک ڈائجسٹ میں پیش کی گئی تھی۔ اگر ایک مرد جری کو ''بہو بیگم'' کے القاب سے نوازا جائے، جس کے مضمرات محتاج بیان نہیں تو اس کی مبینہ حق جوئی اور کینہ پروری کا پورا پورا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور کوئی فردِ واحد ہی نہیں، سارے آوے کا آوا سامنے آ جاتا ہے اور تمام کا تمام دور پوری طرح مشخص ہو جاتا ہے۔

علیٰ ہذا یہ واقعہ کہ بہادر شاہ ظفر جسے اب عہد آزادی کی روشنی میں شاہِ مظلوم اور بطل حریت کے طور پر دیکھا جانے لگا ہے ان کے متعلق خواجہ حسن نظامی نے یہ اہم اطلاع فراہم کی ہے کہ انہوں نے آخری عمر میں ایک طوائف سے شادی رچا لی تھی اور خواجہ صاحب یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکے کہ اس پیرانہ سالی میں اس کارِخیر کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے اس واقعہ کا اس زمانہ کے خاص و عام پر کیا اثر ہوا ہوگا اور فضا کے بد سے بد تر ہونے پر جب نحوست پس و پیش منڈلا رہی تھی اور تباہی کے گھناؤنے بادل گھر گھر کر آ رہے تھے اس کا نتیجہ کیا ہوا ہوگا۔ اس عہد میں خلوت خانہ صوفی بھی سلاطین و امراء کے طلسم کدہ مجاز سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ فراموش نہیں کر سکتے کہ اسی دور میں جنرل بخت خان اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جیسے افراد بھی پیدا ہوئے جن کے

کردار اور کارہائے نمایاں سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ خواص ہی نہیں عوام میں بھی جرأت و مردانگی اور اخلاقِ عالیہ کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے انسان ششدر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک انگریز ماہر حربیات ہی کا کہنا ہے کہ دیسی سپاہیوں نے عدیم النظیر جواں مردی اور جواں سپاری کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ جرأت اور ہمت میں کسی سے کم نہ تھے۔

دراصل تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے جسے یاد رکھنا ضروری ہے۔ انسانی فطرت میں نفسانفسی اور قوم فروشی و غداری کا عنصر جو کب، کہاں اور کس قوم میں ظاہر نہیں ہوا۔ تمام انسانی تاریخ اس گھناؤنے عنصر سے داغدار ہے۔ آج بھی بہترین ترقی یافتہ اقوام پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ایسے کئی ناسور رِستے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا، جب امریکہ کے ایک بڑے شہر میں جو تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا ہے، آدھے گھنٹے کے لیے بجلی فیل ہوگئی تو کیا کچھ نہیں ہوا۔ ایسے واقعات کو دیکھتے ہوئے جبلی شر ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بہیمیت کا عنصر ہر دور میں کارفرما رہا ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ جن قوموں کو ہم فسق و فجور کا بدترین مظہر خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ جنگ عظیم میں کس دل گردے کا ثبوت دیا۔ خوب وزشت کی یہ دوعملی برصغیر کے دورِ سلف کا بھی خاصہ رہی اور ہمیں اس دھوپ چھاؤں کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔

ان امور سے قطع نظر جو محض جملہ معترضہ کے طور پر بیان کیے گئے ہیں اور باتوں باتوں میں اُن کا ذکر نکل آیا ہے۔ کشفی صاحب نے متعلقہ دور سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اُن کے محاکمے، ان کے نتائج درست بھی ہیں اور حقیقت افروز ہوتے ہوئے اثر آفرین بھی۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا، اور بے ساختہ شرلاک ہومز جیسے سراغرساں کا خیال آتا ہے جو بڑی احتیاط سے ہر چھوٹی بڑی بات کا مشاہدہ کرتا، نزدیک و دور نظر دوڑاتا، پتے کی باتیں دریافت کیے جاتا ہے اور جو قدم اٹھاتا ہے صحیح ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عین مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم تیر بہدف کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے نیچے کے علاقے پر نظر ڈال رہے ہوں اور اس کا ہر چھوٹا بڑا، سایہ دار و روشن منظر ہمارے سامنے ہو اور ہم با معان نظر اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس علاقہ کی نوعیت کا صحیح اندازہ کرسکیں۔

کئی امور جو اس تحقیقی تصنیف میں زیربحث آئے ہیں، دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ مثلاً قومیت کا مسئلہ، کشفی صاحب نے اس کی توضیح کرتے ہوئے اس کے ترکیبی عناصر بیان کیے ہیں اور کہا کہ قومیت کو جدید دور کی پیداوار قرار دینا جس سے ہم اہل مغرب کے ذریعے متأثر ہوئے ہیں درست نہیں۔ ان کا

یہ خیال محل نظر ہے۔ برصغیر میں اس کی مثال دکن کی شیعہ سلطنتیں ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے اجنبیوں اور مقامی باشندہ ہونے کا شدید احساس تھا اور ملکی غیر ملکی کا یہ امتیاز موجودہ زمانے میں بھی برقرار رہا۔ شیعیت اس قومیت کے جذبہ کی متحرک تھی۔ جس نے اسے واضح تشخص عطا کیا۔

واضح رہے کہ اقبالؒ نے اسے مردان فرنگی کے پاپائیت کو برطرف کرنے کا نتیجہ قرار دیا ہے کیوں کہ یورپ میں کوئی مرکزی طاقت باقی نہ رہی اور ہر علاقہ میں جداگانہ حکومتیں/ ریاستیں قائم ہو گئیں جن کی بنیاد شدید عصبیت پر تھی۔ بعدازاں جب اس شدید علاقہ وارانہ ریاستوں نے مشرقی ممالک پر تسلط جما لیا تو قومیت کی جنس اقوام مشرق میں بھی برآمد کی گئی۔

اسلامی دور میں قومیت کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی نوعیت وہ نظر نہیں آتی جو اقوامِ مغرب سے مخصوص ہے۔ کشفی صاحب نے اور بھی پیچھے کی طرف جاتے ہوئے فردوسی کو قومیت کا پہلا نقیب قرار دیا ہے۔ حافظ محمود خان شیرانی نے علی رؤس الاشہاد یہ واضح کیا ہے کہ ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار

کہ تخت کیاں می کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

کی ڈرامائی حیثیت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ سلطانِ وقت نے اس موقع پر کہے تھے، جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا تھا اور اس پر تسلط قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ فردوسی کی لسانی عصبیت بھی شیرانی کی توضیحات کی روشنی میں محتاجِ ثبوت ہے۔ اس کے رافضی ہونے کی طرح یہ بھی قیاسی بات ہے۔ جیسا کہ اس نے خود بھی وضاحت کر دی ہے۔ اس زمانہ میں عربی الفاظ نے فارسی میں زیادہ راہ نہیں پائی تھی۔ اس لیے فردوسی اور اس کے معاصر شعراء میں دری زبان کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ بات بھی شیرانی نے مثالیں دے دے کر موازنہ کرتے ہوئے واضح کر دی ہے۔ اس لیے فردوسی پر غالی قسم کی قومیت کا گمان مشکل ہے۔ تاہم جیسا کہ ابن خلدون نے واضح کیا ہے قومیت خواہ کسی شکل میں ہو، کا عصبیت سے گہرا رشتہ ہے۔ بہرکیف زیربحث عجمی قومیت جارح یا نسلی قسم کی قومیت نہ تھی جو جدید قسم کے استعمار اور استحصال پر مبنی ہو۔ دکن کی شیعہ سلطنتوں میں جمعیت مقصود تھی۔ بایں ہمہ قومیت کا جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ قابل غور ہے۔

خواہ کوئی سرزمین ہو، ایران، توران، ہسپانیہ یا ہندوستان، مقامی حالات کا اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ اس لیے برصغیر میں مقامی اثرات کی بتدریج ریشہ دوانی ناگزیر تھی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ زبان و ادب بھی مقامی حالات سے متأثر نہ ہوں۔ سوال صرف اثرات کی مقدار اور نوعیت کا ہے۔ آیا وہ

سرسری تھے یا وسیع پیمانے پر۔ راجہ رام نرائن موزوں کا یہ شعر ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزرا

سراج الدولہ کی شہادت سے متعلق ہے۔ اگر اس واقعہ کا علم نہ ہو یہ عام قسم کا غزلیہ روایتی شعر ہے۔ غزالاں، مجنوں، دوانہ، ویرانہ، تمام رسمی اور غیر ملکی تلمیحات ہیں بلکہ سارا تصور ہی اجنبی ہے۔ لہٰذا مقامی اثرات کے تجربہ میں تمام عوامل کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ فاضل محقق نے جن اشعار کے حوالے دیے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

جس طرح برصغیر یا شبہ قارۂ ہند وسیع ہے اسی طرح مقامی اثرات بھی گوناگوں ہیں۔ ہر علاقہ کی مختلف تاثیر ہے۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب دولت آباد پہنچا تو وہاں کی پرسکون فضا نے اس میں صوفیانہ رجحان پیدا کر دیا۔ جو لامحالہ شعراء پر بھی اثرانداز ہوا ہوگا۔ ایسے عوامل زبان و ادب وقتاً فوقتاً تغیرات کا باعث ہوئے ہیں۔ جب سے اُردو زبان کا مختلف علاقوں سے گزر ہوا ہے۔ سرحد، سندھ، پنجاب، دہلی، دکن اور پھر دہلی اور اودھ وغیرہ۔ تو مقامی اثرات کے باعث نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔

نفسیاتی عوامل بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں اور ان کو انسانی فطرت کی روشنی ہی میں دیکھنا مناسب ہے۔ قومی کردار انسانی سرشت ہی سے مرتب ہوتا ہے اور اس کے عروج و زوال کا باعث بنتا ہے۔ لائق مصنف نے اسی بناء پر امراء کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ سیاسی زوال سے پہلے اخلاقی تنزل قوم کو گھن کی طرح کھا چکا تھا۔ اور اس کی شکست کا باعث ہوا۔ نفسیات کی سطح پر عجیب و غریب حقائق سامنے آتے ہیں جن کی نوعیت صریحاً عالمی ہے۔

یاد نہیں آ رہا کس مورخ نے بیان کیا ہے کہ شہنشاہ بابر نے ایک ہندو لڑکا دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گئے۔ اس کے باپ سے مانگ لینے کی فرمائش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ترکی کی تاریخ میں بھی ایسی ہی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں۔ بعض دیگر مشرقی ممالک بھی اس سے نسبتِ خاص رکھتے ہیں۔ بعض جدید ترقی یافتہ ممالک کا ذکر خود کشفی صاحب نے کیا ہے جہاں اس رجحان کو قانونی جواز حاصل ہے۔ آسٹریلیا کو آپ ایک توانا قوم ہی کہیں گے۔ ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ اللہ بندی امرد، رجی امرد اور سلطانہ امرد کے مدمقابل اس قوم میں بھی موجود ہیں اور ان کے پرستار ان پر اسی طرح فخر کرتے ہیں جس طرح آزاد کے بیان کے مطابق ترکستان میں مردانِ پارسا بھی ایک ذاتِ خاص پر

فخر کرتے تھے۔ بہرحال اُردو شاعری میں اس نفسیاتی حقیقت کو خاصا دخل رہا ہے اور اس کی پردہ پوشی یا توجیہ لاحاصل ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے شہنشاہ اکبر کو نئی قومیت کا بانی قرار دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اکبر کوئی نئی قومیت قائم نہیں کر سکا جس کے لیے مولانا وحید الدین سلیم نے ہند لمانی کی اصطلاح وضع کی تھی۔ تاہم اس نے اس کی کوشش ضرور کی تھی اور جس طرح اس کی پالیسی کے تحت ہندومسلم کافی گھل مل گئے تھے۔ اس عہد کی حد تک اس اختلاط کو قومیت کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔عملاً اکبر کی یہ کوشش پنپ نہ سکی۔ اس لیے یہ قومیت جو حالات مساعد ہونے اور ہندوؤں مسلمانوں کے شدت سے پابند روایت نہ ہونے کی صورت میں ابھر سکی تھی، ٹھٹھر کر رہ گئی۔

تصوف اور بھگتی کی تحریکوں کے باوجود ہندوؤں مسلمانوں کے فکری و تہذیبی دھارے الگ الگ ہی رہے جن کا نتیجہ بالآخر بٹوارا ہی ہو سکتا تھا اور وہ ہو کر رہا۔

پنجاب میں دیکھیے کیسی کیسی داستانیں لکھی گئی جن میں ہندو افراد قصہ یا ہیرو، ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ ان داستانوں اور لوک کہانیوں میں مسلمان مقامی تہذیب میں رچے بسے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہیر وارث شاہ میں ہیرو جوگی بال ناتھ کا چیلا بن کر کانوں میں بالے تک پہن لیتا ہے۔ ادھر بنگال کے پوتھی ادب میں بھی پلہ اسی طرف جھکتا نظر آتا ہے۔

ظاہر ہے کہ برصغیر میں زبان، ادب، سماج وغیرہ تمام شعبوں میں جو کچھ ہوا ایک قدرتی عمل تھا اور اس کا وقوع پذیر ہونا لازم تھا اور ان حالات کی طبعی پیداوار تھا۔ مقامی ماحول میں رہتے ہوئے اس کے اثرات قبول کرنا قدرتی بات تھی اس لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ یہاں کے عہد بہ عہد حالات و واقعات کسی نہ کسی طرح شعور اور ادب پر وقتی طور پر اثر نہ چھوڑتے۔ سوال صرف اتنا تھا کہ کس حد تک کس بات نے کیا اثر چھوڑا؟ ظاہر ہے کہ اسلامی اثرات کے ساتھ ایک نئی زندگی ابھری۔ ہند آریائی زبانوں کا ظہور اس کی بین علامت ہے۔ زندگی نو آبادیاتی تھی۔ اس لیے اس کے فکر و نظر اور ادب وفن کے مظاہر بھی نو آبادیاتی تھے۔ سوال یہ ہے کہ داغ بیل کیا تھی اور کس حد تک ایک مستقل عنصر کے طور پر قائم رہی۔

اس کا نمایاں ثبوت خود اُردو زبان ہی فراہم کرتی ہے جس کا رخ ظاہر ہے، برصغیر ہی کی دھرتی تھی جس کا مرورِ ایام کے ساتھ برابر ابھرتے جانا لازم تھا۔ جو بھی نو وارد ولایتی یہاں آئے ان کا حلیہ، اوضاع و اطوار، لب و لہجہ، زبان، سب کے سب یہیں کے سانچے میں ڈھلتے گئے۔علمی حیثیت

سے اس کا بین ثبوت البیرونی کی ہندیہ ہے۔ جس میں بالکل ہی ابتدائی دور میں ہندو تہذیب و ثقافت کا ہر پہلو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اس طرح اُردو زبان کی نوعیت مخلوط ہے۔ اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی ہندی زبان ہے جس میں فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے الفاظ داخل ہو کر اسے ریختہ بناتے رہے ہیں۔ زبان بہرحال بنیادی طور پر ہندی ہی رہی اور فی الحقیقت گوناں گوں عناصر کا مجموعہ ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بعض مظاہر معجون مرکب سے کم نہیں۔ مثلاً غزلیں جن میں آدھا مصرع فارسی اور آدھا ہندی ہے۔ دو غزلے، سہ غزلے، حضرت انشاء اور ان کے معاصرین کے انداز میں۔ اُردو ہی کا اضافہ و توسیع ہیں۔ کہیں کہیں مقامی جھلکیاں ضرور ہیں مگر محض اشارات یا اتفاقات کی حد تک ان میں کسی قومی شعوری محرک کی کارفرمائی محدود دکھائی دیتی ہے۔

اس لیے محاکمہ پر عمومیت کا اطلاق دشوار ہے۔ ویسے جو بھی مقامی ارتسامات یا نقوش ابھرے ہیں وہ غنیمت ہیں اور اس حقیقت کی خبر دیتے ہیں کہ خواہ راسخ عواید و عندیات کچھ ہوں، گرد و پیش کے حالات اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہاں تناسب کا سوال بھی پیدا ہوگا کہ جس نوعیت کی غزلیات پیش کی گئی ہیں ان میں مقامی جھلکیوں کی مقدار کس حد تک ہے۔ کشفی صاحب نے جن جھلکیوں کی نشان دہی کی ہے ان سے بلاشبہ ایک اہم اور خاصے معتبر پہلو کا احساس ہوتا ہے۔ اور آئندہ قدیم ادب کا جو بھی مطالعہ پیش کیا جائے اس میں اس پہلو کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

دکنی ادب کی چھان بین سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ ما بعد دہلوی اور لکھنوی ادب کا پیش خیمہ تھا اور اس میں کتنے ہی ادبی مظاہر و شؤنات ظہور میں آ چکے تھے اور ان کو خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے پیش نظر نظیر اکبر آبادی قدرتی اور واقعاتی شاعری کا کوئی اچانک مظہر نہ تھا بلکہ اس کی شاعری دکنی شاعری کے سلسلے کی کڑی تھی۔ اور دکنی کی جانشین، نسبتاً نئی اُردو زبان کا مجدد ادب تھی۔

قطب قلی شاہ نے حافظ کی غزلوں کو جو مقامی وضع عطا کی، جہاں فارسی کے محیط اثر کی غمازی تھی۔ یعنی فکر و شعور اور تہذیب و ثقافت کا رخ ایران ہی کی طرف تھا۔ وہاں اپنے عہد کی زبان کی طرف ناگزیر میلان کی آئینہ دار بھی تھی۔

مثنوی کے فروغ میں خواہ مقامی حد تک موضوعات یا احوال کتنے ہی جاری و ساری کیوں نہ

ہوں ظاہر ہے ان کا نمونہ فارسی، رزمیہ داستانی شاعری ہی تھا۔ یعنی شاہنامہ، سکندر نامہ وغیرہ...... کیوں کہ اس زمانے میں پیروی مشرقی (ایرانی) ہی کا رجحان غالب تھا۔ تاہم یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ بہادر شاہ ظفر نے جس کے شعور کو قومی شعور کا نمائندہ قرار دینا چاہیے کن کن زبانوں میں شاعری نہیں کی۔ اور گیت، ٹھمریاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ کثیر تعداد میں تحریر کیں جو اپنے دیس، اپنی دھرتی اور اپنی فضا کی خبر دیتی ہیں۔

ان امور کے پیش نظر اس تاریخی، سیاسی، لسانی اور ادبی مطالعہ کا تکملہ موعودہ دوسری جلد میں دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں کشفی صاحب کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس اہم معاملہ میں پیش قدمی کا وعدہ کیا ہے جس کے سامنے آنے کا انتظار رہے گا۔ ویسے موجودہ کتاب اپنی جگہ اُردو ادب کی ایک مکمل اور اہم دستاویز ہے اور ایک حوالہ کی کتاب کی حیثیت سے اس سے استفادہ ناگزیر ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ بی-اے (آنرز) جامعہ سندھ، ایم-اے (اُردو) جامعہ کراچی، پی ایچ ڈی (اُردو) جامعہ کراچی، ایم-اے (لسانیات اور تدریسی انگریزی) کولمبیا یونیورسٹی، پروفیسر برائے زبان ہائے خارجی شعبہ پاک و ہند، جامعہ اوساکا (جاپان) اور اب عرصہ دراز سے جامعہ کراچی میں اُردو زبان و ادب کے پروفیسر ہیں۔

۲۔ یہ کتاب دوسرے جدید دور سے متعلق حصے کے ساتھ جس کی تکمیل میں فاضل مصنف اب مصروف ہیں، یقیناً ایک نادر پیش کش ہوگی جس سے اُردو ادب کا صحیح منظرنامہ تیار ہو جائے گا اور اس کی ایک مربوط و مسلسل متحرک تصویر نظروں کے سامنے آ جائے گی۔

☆☆☆☆☆